دینی تعلیم میں اصلاح کی ضرورت

مولینا منت اللہ قاسمی ؎

آج سے تقریباً سو سال پہلے ہندوستان میں ایک طرف تو انگریزی حکومت اپنے پنجے مضبوط کر رہی تھی۔ دوسری
رف عیسائی مشنریوں کا جال پھیلایا جا رہا تھا اور یورپین مبلغین ہر طرف گھوم گھوم کر عیسائی مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے
ی زمانہ میں حکومت کو کچھ ایسے مسلمان بھی مل گئے جن کے نزدیک دینی اور دنیاوی ترقی کا مدار اسی پر تھا کہ نسل تو
ندوستانی رہے لیکن ظاہر و باطن یورپین ہو جائے۔ حکومت نے ایسے مسلمانوں سے پوری طرح کام لیا۔ غرض اسوقت
امی کی زنجیریں مضبوط کی جا رہی تھیں۔ الحاد و بے دینی کی آندھی چل رہی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پورا ملک عیسائی
جائے گا اور ہندوستان کو کبھی آزادی نصیب نہ ہوگی۔

اسی کے ساتھ دینی تعلیم کی مسندیں خالی ہو چکی تھیں اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمۃ کے علوم و معارف
ء دارث بھی ختم ہوتے نظر آرہے تھے۔ ان حالات میں خدا کے ایک برگزیدہ کو دارالعلوم کا خیال یا۔ اور حضرت نانوتوی
الرحمۃ نے فیصلہ کیا کہ اس وقت دین کی حفاظت اور مسلمانوں اور اُن کے آنے والی نسلوں کو باقی رکھنے کا کام ایک
العلوم ہی انجام دے سکتا ہے۔ جہاں کتاب و سنت کی تعلیم ایسے نہج پر دی جائے کہ یہاں کے فارغین، سلف کا نمونہ
کر ملک کے کونہ کونہ میں پھیل جائیں۔ خود نجات پائیں اور دوسروں کو نجات کا راستہ بتلائیں۔

؎ مولانا منت اللہ صاحب قاسمی امیر شریعت بہار و اڑیسہ نے یہ بیان چند سال ہوئے دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے سامنے
ھا تھا، اس بیان میں جو تجاویز پیش کی گئی ہیں حُسن اتفاق سے شوریٰ نے حال ہی میں انہیں منظور کر لیا ہے۔ ایک نصاب کمیٹی بنادی
ہے جو نصاب میں ضروری ترمیم کرے گی۔ معلوم ہوا ہے شوریٰ نے دارالعلوم دیوبند میں انگریزی کو بحیثیت ایک مضمون کے داخل
ب کر لیا ہے۔ یہ بیان مدینہ بجنور سے ماخوذ ہے۔ (مدیر)

دارالعلوم اسی مقصد سے قائم ہوا اور آج تک اسی راہ پر چل رہا ہے۔ اور پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور آج پورے ملک میں انتہائی ناساعد حالات کے باوجود دین اور دینداری موجود ہے وہ دارالعلوم ہی کا طفیل ہے، اس لمبے چوڑے ملک میں آج سینکڑوں مدارس ہیں جہاں مسلمانوں کی اولاد خدا کا دین سیکھتی ہے، دارالعلوم ہی کے فارغ التحصیل حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آزادی کے بعد اس ملک میں علماء اور دینداروں کی جماعت، برادران وطن کی نگاہوں میں بھی عزت کا مقام رکھتی ہے۔ یہ صرف اسی لئے کہ حضرت نانوتویؒ حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ، حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے اکابر اور دارالعلوم کے موجودہ شیخ نے صرف درس وتدریس کا کام انجام نہیں دیا بلکہ یہ حضرات جنگ آزادی کے بھی ہیرو ہیں، اگر دارالعلوم اور اس کے فضلائے جنگ آزادی میں پورا حصہ لیا ہوتا تو آج ہندوستان میں علماء کی وہی حالت ہوتی جو انقلاب کے بعد ترکیا دوسرے ممالک میں ہوئی۔

دارالعلوم نے ہمیشہ ملک کے حالات کو کتاب وسنت کی روشنی میں دیکھا ہے۔ ملک کی ہر تحریک اور ہر اقدام کا اسی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا ہے اور پھر اس میں شرکت ہی نہیں کی ہے بلکہ اس کی رہنمائی کی ہے۔ دارالعلوم کی پالیسی کبھی جامد نہیں رہی ہے اس نے ہمیشہ ترقیاتی منصوبوں کا ساتھ دیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کے مقصد کے معاون ہوں یا کم از کم معارض نہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آج بھی دارالعلوم ہر جدید کو اسی شرط کے ساتھ لبیک کہے گا۔

دین کی تعلیم واشاعت کا سلسلہ خیرالقرون سے آج تک جاری ہے لیکن علوم، طریقۂ تعلیم اور کتب درسیہ ہر زمانہ میں مختلف رہیں۔ اور یہ اختلاف مسلمانوں کے ماحول، ملک کے حالات اور رجحانات کے تابع رہا۔ بہت سے علوم وفنون خیرالقرون میں مدون ہی نہیں ہوئے تھے یا اس دور میں اس کی تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ منطق، فلسفہ، ہیأت اور علم معانی کی ترتیب وتہذیب بعد میں ہوئی۔ اصول فقہ کی تعلیم امام شافعیؒ کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ دوسری صدی ہجری کے نصف تک تعلیم کا طریقہ زبانی روایت وراملا تھا جو علامہ سیوطیؒ اور . . . . تک جاری رہا۔ ایک زمانہ میں مختلف ملکوں کے طریقہ تعلیم میں بھی فرق تھا۔ اندلس میں پہلے قرآن مجید پڑھاتے اور اس کے بعد اشعار اور فن انشاء کے مسائل بتلاتے۔ افریقہ میں قرآن کے ساتھ حدیث کا درس دیتے۔ ابوبکر ابن العربی نے تعلیم کا کچھ اور طریقہ اختیار کیا اور اسی زمانہ

کے طریقۂ تعلیم پر کہ پہلے قرآن پڑھایا جائے یا دو علوم ایک ساتھ پڑھائے جائیں توجہ کی۔ کتب درسیہ میں تو بہت زیادہ تبدیلی ہوتی رہی۔ پہلے امام محمدؒ کی کتاب اصل درس تھی پھر ابو زید دبوسی اور بزدوی کی تصانیف کا رواج ہوا۔ پھر ابن السمعانی کی کتاب البدایہ تمام مدرسوں میں جاری ہوئی اس کے بعد ہدایہ، شرح وقایہ نصاب میں داخل ہوئیں۔ یہی حال ادب، علم کلام اور فن منطق وغیرہ کا رہا۔ لیکن ایک بڑا فرق یہ ہے کہ متقدمین اس کو محض آلہ اور ذریعہ کی حیثیت سے پڑھاتے تھے، متاخرین نے اس کو مستقل علم بنا لیا ہے اور مقصودیت کی شان پیدا کر دی ہے۔

ہندوستان میں ملّا نظام الدین نے پچھلے تمام طریقوں سے ہٹ کر ایک نیا نظام اور نصاب درس بنایا جسے قبول عام حاصل ہوا، لیکن خود ملّا صاحب نے درس نظامی سے ہٹ کر طلباء کو فصوص الحکم اور بخاری شریف کا درس دیا اور ملّا صاحب کے بعد صحاح ستہ، ملاحسن، حمداللہ، قاضی مبارک، غلام یحییٰ وغیرہ درس نظامی میں داخل کی گئیں اور آج تک پڑھائی جاتی ہیں۔

غرض ہر دَور میں وقت کی ضرورت اور زمانہ کے حالات کے مطابق نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ آج بھی وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ تعلیمی نصاب پر دوبارہ غور کیا جائے اور خصوصاً تقسیم ہند کے بعد جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں نظام تعلیم میں اُن کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

میرے خیال میں اس مسئلہ پر غور کرتے وقت حسب ذیل اُمور کو سامنے رہنا چاہئے:-

(۱) ہر طالب دین کو عربی زبان اور عربی نصاب کے ذریعہ دین سکھلانا، نہ صرف یہ ضروری نہیں بلکہ اکثر اس طریقہ کار سے علوم دینیہ کا استخفاف ہوتا ہے۔ علم اور علمی جماعت کی ساکھ پر سخت ضرب پڑتی ہے جیسا کہ ان دنوں عام طور پر مشاہدہ ہو رہا ہے۔ ہر طالب علم دین کو میزان سے بخاری شریف تک پڑھانا اُستاد اور طالب کے وقت اور قوم کے روپئے کو ضائع کرنا ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ دین اور مدارس دینیہ کا اعتماد لوگوں کی نظر میں کم ہو جائے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے جس میں مادری زبان کے ذریعہ طلباء کو دینی تعلیم دی جائے اور پھر ان میں سے طلباء کا انتخاب کیا جائے اور انہیں عربی نصاب کے ذریعہ دین کی تعلیم دی جائے۔

(۲) نصاب تعلیم کا محور اور مرکز قرآن، حدیث اور فقہ ہو، اور جو کچھ بھی پڑھایا جائے وہ انہیں کو جاننے اور سمجھنے کے لئے۔

(۳) نصاب میں ایسی کتابوں کو نظر انداز کر دیا جائے جن میں اصل مسئلہ سے قیل وقال ہو یا طرز ادا مشکل اور پیچیدہ ہو، لیکن

نئی کتابوں کے انتخاب کے وقت یہ امر پیش نظر ہے کہ قدماء کا مقصد قرآن و حدیث کی خدمت تھا، اس لئے انہوں نے علوم کی ایجاد و ترتیب اور کتابوں کی تصنیف اسی نظریہ سے کی ہے۔ لیکن ان دنوں مصر وغیرہ میں مصنفین کا مقصد زبان عربی اور مختلف علوم جدیدہ کی براہ راست خدمت ہے، اس لئے جدید تصانیف بالعموم اسی نظریہ کے ماتحت ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتابیں دینی نصاب تعلیم کے لئے کچھ زیادہ کارآمد نہ ہونگی۔

(۴) سیرت نبویؐ اور خلفاء راشدین کی سوانح کو اسلام میں آئینی حیثیت حاصل ہے اور ضروری ہے کہ ایک عالم کی نظر پوری اسلامی تاریخ پر گہری ہو۔ اس لئے تاریخ اسلام کو داخل نصاب کیا جائے اور وہ پہلو اجاگر کیے جائیں جن کی اس زمانہ میں سخت ضرورت ہے۔

(۵) منطق اور فلسفہ کی کتابیں اسی قدر داخل نصاب ہوں جس سے اس فن کے مصطلحات پر عبور ہو سکے اور متاخرین کے علمی ذخیرے سے استفادہ میں دقت نہ ہو۔

(۶) موجودہ علم کلام ان شبہات کا جواب دیتا ہے جو یونانی فلسفہ نے پیدا کئے تھے۔ اب اعتراضات اور شبہات کی نوعیت بالکل بدل چکی ہے۔ اس لئے علم کلام کی ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جو دور حاضر کے پیدا کردہ اعتراضات اور شبہات کو دور کر سکیں۔

(۷) عربی ادب کی تعلیم اسی حد تک ہو جس سے قرآن و حدیث و فقہ اور اس سے متعلقہ علوم و فنون کو بے تکلف سمجھا جا سکے۔ عربی ہماری مذہبی زبان ہے۔ لیکن مادری زبان نہیں۔ عربی گفتگو اور تقریر و تحریر کی مشق پر زیادہ زور دینا طلباء کو ایک ایسے کام پر لگاتا ہے جو دارالعلوم کی چہار دیواری سے آگے نہیں بڑھ سکتا، عربی تحریر و تقریر کی ساری مشق گھر جا کر ختم ہو جائے گی جہاں برس ہا برس اور اکثر فارغین کو زندگی کی آخری سانس تک نہ کوئی عربی بولنے والا ملے گا اور نہ سمجھنے والا۔ ہاں مادری زبان میں تقریر و تحریر کی مشق پر زور دیا جائے کہ یہی زبان دین کی اشاعت اور علوم کی ترویج کا ذریعہ ہے ہاں نصاب میں اس کی گنجائش ضرور رکھی جائے کہ اگر کچھ طلباء فراغت کے بعد علوم و فنون میں جن میں ایک عربی ادب بھی شامل ہے مہارت حاصل کرنا چاہیں تو انھیں اس کا موقع حاصل ہو۔

(۸) علم جغرافیہ، فلسفہ جدید اور سائنس کی بھی ایسی کتابیں رکھی جائیں جس سے طلباء کو اس فن کی عام اور ضروری معلومات حاصل ہو جائیں اور وہ ان علوم کو اور ان مسائل کو اجنبی محسوس نہ کریں۔

(۹) علم اخلاق کو بھی داخل کیا جائے جس میں امراض قلبیہ اور نفسیہ اور اس کے علاج سے بحث کی جاتی ہے کہ ظاہری و باطنی اخلاق کی اصلاح ہو سکے۔

(۱۰) ملک کی سرکاری زبان بھی ضروری حد تک لازم کی جائے۔

(۱۱) قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ دور حاضر کے نئے مسائل سے طلباء پڑھنے ہی کے زمانے سے واقف ہوتے جائیں۔ درس کی وہ تقریریں جو عام طور پر کی جاتی ہیں اس دور میں کارآمد نہیں ہو سکتیں۔ دور بدل چکا، آج کے مسائل بھی دوسرے ہیں، اور اعتراضات اور شبہات بھی دوسرے۔ غور و فکر کا طریقہ بھی نیا ہے اور طرز تعبیر بھی نیا۔ اب نہ وہ بحثیں ہیں اور نہ وہ حجتیں اور نہ مجادلے ہیں نہ مناظرے۔ ایک زمانہ تھا کہ کتاب کا مسئلہ شروح، تعلیقات، منہیات اور بین السطور و حواشی کے بغیر حل ہی نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ زمانہ ہے کہ ایسی بات بتلائیے جو دین و دنیا میں کارآمد ہو، اور ایسے سلجھے ہوئے اور صاف انداز میں کہئے کہ طبع سلیم کو اپیل کرے اور دل میں گھر کر جائے۔ اس لئے درس کا انداز ایسا اختیار کرنا ہوگا کہ طلبہ فراغت کے بعد عہد حاضر کی دینی ضرورت کو پورا کر سکیں اور جب اُن کو نئے مسائل سے سابقہ پڑے، تو اپنے کو بے بس محسوس نہ کریں۔

تعلیم کے ساتھ طلباء کی تربیت کا بھی ایک مضبوط نظام قائم کیا جائے اور ڈھنگ سے ان کی تربیت کی جائے کہ ان کا مقصد تعلیم دین سے حصول معاش نہ ہو۔ ان کا مقصد دین کی خدمت ہو اور اس راہ میں مصائب کا جھیلنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھیں، اُن کی نظر حکومت کے عہدوں اور بڑی بڑی تنخواہ پر نہ ہو۔ معاشی تنگی کے باوجود دین کی خدمت اس طرح کر سکیں جس طرح اونچے عہدوں اور بڑی تنخواہوں کے بعد وہ کر سکتے۔ سرکاری مدارس کے فارغین کا ہمیں کافی تجربہ ہے۔ چونکہ انہیں سرکاری ملازمتوں میں کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں اس لئے ان کے پڑھنے اور پڑھانے کا مقصد صرف سند اور اس کے ذریعہ ملازمت کا حصول ہوتا ہے، اور بس، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں مگر دین کی خدمت نہیں کر سکتے۔ دینی تعلیم کا ایسا نظام جس کے ذریعہ فارغ طلباء کو وہی حقوق حکومت کے مناصب اور ملازمتوں میں حاصل ہو سکیں جو سرکاری کالجوں کے فارغین کو حاصل ہوتے ہیں وہاں قائم کیا جا سکتا ہے جہاں کی دینی و سرکاری زبان ایک ہو اور حکومت اسی دین پر یقین رکھتی ہو جس دین کی تعلیم کا ادارہ اور نظام ہے، لیکن ہندوستان جیسے ملک میں یہ نظریہ اسلام کے لئے نہ مفید ہے نہ ممکن۔